کہ اللہ تعالیٰ نے سترہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں۔ آسمانوں والے ایک عالم زمینوں والے سب ایک عالم اور باقی کو اللہ ہی جانتا ہے۔ مخلوق کو ان کا علم نہیں۔ ابو العالیہؒ فرماتے ہیں انسان کل ایک عالم ہیں سارے جنات کا ایک عالم ہے اور ان کے سوا اٹھارہ ہزار یا چودہ ہزار عالم اور ہیں۔ فرشتے زمین پر ہیں اور زمین کے چار کونے ہیں' ہر کونے میں ساڑھے تین ہزار عالم ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ قول بالکل غریب ہے اور ایسی باتیں جب تک کسی صحیح دلیل سے ثابت نہ ہوں ماننے کے قابل نہیں ہوتیں۔

حمیریؒ کہتے ہیں ایک ہزار امتیں ہیں' چھ سو تری میں اور چار سو خشکی میں۔ سعید بن مسیب سے یہ بھی مروی ہے۔ ایک ضعیف روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کے زمانے میں ایک سال ٹڈیاں نہ نظر آئیں بلکہ تلاش کرنے کے باوجود پتہ نہ چلا۔ آپ غمگین ہو گئے' یمن' شام اور عراق کی طرف سوار دوڑائے کہ کہیں بھی ٹڈیاں نظر آتی ہیں یا نہیں تو یمن والے سوار تھوڑی سی ٹڈیاں لے کر آئے اور امیر المومنین کے سامنے پیش کیں۔ آپ نے انہیں دیکھ کر تکبیر کہی اور فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے۔ آپ فرماتے تھے' اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار امتیں پیدا کی ہیں جن میں سے چھ سو تری میں ہیں اور چار سو خشکی میں' ان میں سے سب سے پہلے جو امت ہلاک ہوگی وہ ٹڈیاں ہوں گی۔ بس ان کی ہلاکت کے بعد پے در پے اور سب امتیں ہلاک ہو جائیں گی جس طرح کہ تسبیح کا دھاگا ٹوٹ جائے اور ایک کے بعد ایک سب موتی جھڑ جاتے ہیں۔ اس حدیث کے راوی محمد بن عیسیٰ ہلالی ضعیف ہیں۔ سعید بن مسیب رحمہ اللہ سے بھی یہ قول مروی ہے۔

وہب بن منبہ فرماتے ہیں' اٹھارہ ہزار عالم ہیں۔ دنیا کی ساری کی ساری مخلوق ان میں سے ایک عالم ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں چالیس ہزار عالم ہیں۔ ساری دنیا ان میں سے ایک عالم ہے۔ زجاج کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں جو کچھ پیدا کیا ہے' وہ سب عالم ہے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ یہ قول صحیح ہے اس لئے کہ یہ تمام عالمین پر مشتمل لفظ ہے۔ جیسے فرعون کے اس سوال کے جواب میں کہ رب العالمین کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ آسمانوں زمینوں اور دونوں کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کا رب۔ عالم کا لفظ علامت سے مشتق ہے اس لئے کہ عالم یعنی مخلوق اپنے پیدا کرنے والے اور بنانے والے پر نشان اور اس کی وحدانیت پر علامت ہے جیسے کہ ابن معتز شاعر کا قول ہے۔

فَیَا عَجَبًا کَیْفَ یُعْصَی الْاِلٰهُ   اَمْ کَیْفَ یَجْحَدُهُ الْجَاحِدُ
وَفِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَهٗ اٰیَةٌ   تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

یعنی تعجب ہے کس طرح اللہ کی نافرمانی کی جاتی ہے اور کس طرح اس سے انکار کیا جاتا ہے حالانکہ ہر چیز میں نشانی ہے جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتی ہے۔ اَلْحَمْدُ کے بعد اب اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی تفسیر سنئے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿٢﴾

بہت بخشش کرنے والا بڑا مہربان ○

بہت بخشش کرنے والا بڑا مہربان! ☆☆ (آیت:۲) اس کی تفسیر پہلے پوری گذر چکی ہے۔ اب اعادہ کی ضرورت نہیں۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کے وصف کے بعد الرحمٰن الرحیم کا وصف ترہیب یعنی ڈراوے کے بعد ترغیب یعنی امید ہے جیسے فرمایا نَبِّیءْ عِبَادِیْ الخ یعنی میرے بندوں کو خبر دو کہ میں ہی بخشنے والا مہربان ہوں اور میرے عذاب بھی دردناک عذاب ہیں اور فرمایا تیرا رب جلد سزا کرنے والا اور مہربان اور بخشش بھی کرنے والا ہے۔ رب کے لفظ میں ڈراوا ہے اور رحمٰن اور رحیم کے لفظ میں امید ہے۔ صحیح مسلم شریف میں بروایت

حضرت ابو ہریرہؓ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' اگر ایماندار اللہ کے غضب وغصہ سے اور اس کے سخت عذابوں سے پورا واقف ہوتا تو اس کے دل سے جنت کی طمع ہٹ جاتی اور اگر کافر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی رحمتوں کو پوری طرح جان لیتا تو کبھی ناامید نہ ہوتا۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝

بدلے کے دن (یعنی قیامت) کا مالک ○

حقیقی وارث و مالک کون ہے؟ ☆☆ (آیت:۳) بعض قاریوں نے مَلِكِ پڑھا ہے اور باقی سب نے مٰلِكِ وردونوں قراتیں صحیح اور متواتر ہیں اور سات قراتوں میں سے ہیں اور مالک کے لام کے زیر اور اس کے سکون کے ساتھ۔ اور مَلِيْكِ اور مَلِكِيْ بھی پڑھا گیا ہے۔ پہلے کی دونوں قراتیں معانی کی رو ترجیح ہیں اور دونوں صحیح ہیں اور اچھی بھی۔ زمخشری نے مَلِكِ کو ترجیح دی ہے۔ اس لئے کہ حرمین والوں کی یہ قرأت ہے۔ اور قرآن میں بھی لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ اور قَوْلُهُ الْحَقُّ وَلَهُ الْمُلْكُ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ سے بھی حکایت بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے مَلِكِ پڑھا اس بنا پر کہ فعل اور فاعل اور مفعول آتا ہے لیکن یہ شاذ اور بے حد غریب ہے۔ ابوبکر بن داؤدؒ نے اس بارے میں ایک غریب روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے تینوں خلفاءؓ اور حضرت معاویہؓ اور ان کے لڑکے مالک پڑھتے تھے۔ ابن شہابؒ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مروان نے مَلِكِ پڑھا۔ میں کہتا ہوں مروان کو اپنی اس قرات کی صحت کا علم تھا۔ راوی حدیث ابن شہاب کو علم نہ تھا۔ واللہ اعلم۔

ابن مردویہ نے کئی سندوں سے بیان کیا ہے کہ آنحضرتؐ مالک پڑھتے تھے۔ مالک کا لفظ ملک سے ماخوذ ہے۔ جیسے کہ قرآن میں ہے اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ الخ یعنی زمین اور اس کے اوپر کی تمام مخلوق کے مالک ہم ہی ہیں اور ہماری ہی طرف سب لوٹا کر لائے جائیں گے۔

اور فرمایا قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ یعنی کہہ کہ میں پناہ پکڑتا ہوں لوگوں کے رب اور لوگوں کے مالک کی۔ اور ملک کا لفظ ملک سے ماخوذ ہے جیسے فرمایا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ الخ یعنی آج ملک کس کا ہے' صرف اللہ واحد غلبہ والے کا۔ اور فرمایا قَوْلُهُ الْحَقُّ الخ اسی کا فرمان ہے اور اسی کا سب ملک ہے۔ اور فرمایا آج ملک رحمٰن ہی کا ہے اور آج کا دن کافروں پر بہت سخت ہے۔ اس فرمان میں قیامت کے دن کے ساتھ ملکیت کی تخصیص کرنے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے' اس لئے کہ پہلے اپنا وصف رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ہونا بیان کر چکا ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں شامل ہیں۔ قیامت کے دن کے ساتھ اس کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس دن تو کوئی ملکیت کا دعویدار بھی نہ ہوگا۔ بلکہ بغیر اس حقیقی مالک کی اجازت کے زبان تک نہ ہلا سکے گا۔ جیسے فرمایا جس دن روح القدس اور فرشتے صف بستہ کھڑے ہوں گے اور کوئی کلام نہ کر سکے گا۔ یہاں تک کہ رحمٰن اسے اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے گا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے' سب آوازیں رحمٰن کے سامنے پست ہوں گی اور گنگناہٹ کے سوا کچھ نہ سنائی دے گا۔ اور فرمایا جب قیامت آئے گی اس دن بغیر اللہ تبارک وتعالیٰ کی اجازت کے کوئی شخص نہ بول سکے گا۔ بعض ان میں سے بدبخت ہوں گے اور بعض سعادت مند۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس دن اس کی بادشاہت میں اس کے سوا کوئی بادشاہ نہ ہوگا جیسے کہ دنیا میں مجازاً تھے۔ يَوْمِ الدِّيْنِ سے مراد مخلوق کے حساب کا یعنی قیامت کا دن ہے جس دن تمام بھلے برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ ہاں اگر رب کسی برائی سے درگذر کرلے یہ اس کا اختیاری امر ہے۔ صحابہؓ تابعینؒ اور سلف صالحینؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ بعض سے یہ بھی منقول ہے کہ مراد اس سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

قیامت قائم کرنے پر قادر ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن بظاہر ان دونوں اقوال میں کوئی تضاد نہیں' ہر ایک قول کا قائل دوسرے کے قول کی تصدیق کرتا ہے۔ ہاں پہلا قول مطلب پر زیادہ دلالت کرتا ہے۔ جیسے کہ فرمان ہے اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ الخ اور دوسرا قول اس آیت کے مشابہ ہے جیسا کہ فرمایا وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ یعنی جس دن کہے گا ''ہو'' جا' بس اسی وقت ہو جائے گا واللہ اعلم۔

حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسے فرمایا هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الخ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا' بدترین نام اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شخص کا ہے جو شہنشاہ کہلائے۔ حقیقی بادشاہ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین کو قبضہ میں لے لے گا اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے' پھر فرمائے گا' میں بادشاہ ہوں۔ کہاں گئے زمین کے بادشاہ' کہاں ہیں تکبر والے۔ قرآن عظیم میں ہے' کس کی ہے آج بادشاہی؟ فقط اللہ اکیلے غلبہ والے کی۔ اور کسی کو ملک کہہ دینا یہ صرف مجازاً ہے جیسے کہ قرآن میں طالوت کو ملک کہا گیا اور وَكَانَ وَرَآءَ هُمْ مَّلِكٌ کا لفظ آیا اور بخاری و مسلم میں ملوک کا لفظ آیا ہے اور قرآن کی آیت میں اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا یعنی تم میں انبیاء کئے اور تمہیں بادشاہ بنایا' آیا ہے۔ دین کے معنی بدلے' جزا اور حساب کے ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے' اس دن اللہ تعالیٰ انہیں پورا پورا بدلہ دے گا اور وہ جان لیں گے۔ اور جگہ اِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ کیا ہم کو بدلہ دیا جائے گا؟ حدیث میں ہے' دانا وہ ہے جو اپنے نفس سے خود حساب لے اور موت کے بعد کام آنے والے اعمال کرے۔ جیسے کہ حضرت فاروق اعظمؓ کا قول ہے کہ تم خود اپنی جانوں سے حساب لو۔ اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے اور اپنے اعمال کو خود وزن کر لو اس سے پہلے کہ وہ ترازو میں رکھے جائیں اور اس بڑی پیشی کے لئے تیار ہو جاؤ جب تم اس اللہ کے سامنے پیش کئے جاؤ گے جس سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں۔ جیسے خود رب عالم نے فرما دیا' جس دن تم پیش کئے جاؤ گے' کوئی چھپی ڈھکی بات چھپے گی نہیں۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۵

صرف تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے ہم مدد چاہتے ہیں ○

عبادت کا مفہوم: ☆☆ (آیت:۴) ساتوں قاریوں اور جمہور نے اسے ''اِيَّاكَ'' پڑھا ہے۔ عمرو بن فائدؒ نے اِيَاكَ پڑھا ہے۔ لیکن یہ قراۃ شاذ اور مردود ہے اس لئے کہ ''اِيَا'' کے معنی سورج کی روشنی کے ہیں اور بعضوں نے اِياك پڑھا ہے اور بعضوں نے اياك پڑھا بعض نے هَيَّاكَ پڑھا ہے۔ عرب شاعروں کے شعر میں بھی هَيَّاكَ ہے۔ نَسْتَعِيْنُ کی یہی قرات تمام کی ہے۔ سرائے یحییٰ بن وہاب اور ہے اور اعمش کے۔ یہ دونوں پہلے نون کو زیر سے پڑھتے ہیں۔ قبیلہ بنو اسد' ربیعہ بنت تمیم کی لغت اسی طرح پر ہے۔ لغت میں عبادت کہتے ہیں ذلت اور پستی کو۔ طریق معبد اس راستے کو کہتے ہیں جو ذلیل ہو۔ اسی طرح بغیر معبد اس اونٹ کو کہتے ہیں جو بہت دبا اور جھکا ہوا ہو اور شریعت میں عبادت نام ہے محبت' خشوع' خضوع اور خوف کے مجموعے کا۔ لفظ اِيَّاكَ کو جو مفعول ہے پہلے لائے اور پھر اسی کو دہرایا تاکہ اس کی اہمیت ہو جائے اور عبادت اور طلب مدد اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہو جائے۔ تو اس جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ ہم تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور نہ کریں گے اور تیرے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کرتے اور نہ کریں گے۔ کامل اطاعت اور پورے دین کا حل صرف یہی دو چیزیں ہیں۔

بعض سلف کا فرمان ہے کہ سارے قرآن کا راز سورۂ فاتحہ میں ہے اور پوری سورت کا راز اس آیت اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں ہے۔ آیت کے پہلے حصہ میں شرک سے بیزاری کا اعلان ہے اور دوسرے جملہ میں اپنی طاقتوں اور قوتوں کے کمال کا انکار ہے اور اللہ عزوجل کی طرف اپنے تمام کاموں کی سپردگی ہے۔ اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ جیسے فرمایا فَاعْبُدْهُ

وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ الخ یعنی اللہ ہی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو تمہارا رب تمہارے اعمال سے غافل نہیں۔ فرمایا قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ الخ کہہ دے کہ وہی رحمان ہے۔ ہم اس پر ایمان لے آئے اور اسی پر ہم نے توکل کیا۔ فرمایا رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا یعنی مشرق مغرب کا رب وہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں تو اسی کو اپنا کارساز سمجھ۔ یہی مضمون اس آیہ کریمہ میں ہے۔ اس سے پہلے کی آیات میں تو خطاب نہ تھا لیکن اس آیت میں اللہ تعالیٰ سے خطاب کیا گیا ہے جو نہایت لطافت اور مناسبت رکھتا ہے اس لئے کہ جب بندے نے اللہ تعالیٰ کی صفت وثنا بیان کی تو قرب خداوندی میں حاضر ہو گیا۔ اللہ جل وجلالہ کے حضور میں پہنچ گیا۔ اب اس مالک کو خطاب کر کے اپنی ذلت اور مسکینی کا اظہار کرنے لگا اور کہنے لگا کہ الٰہی ہم تو تیرے ذلیل غلام ہیں اور اپنے تمام کاموں میں تیرے ہی محتاج ہیں۔ اس آیت میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اس سے پہلے کے تمام جملوں میں خبر تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی بہترین صفات پر اپنی ثناء آپ کی تھی اور بندوں کو اپنی ''ثناء'' انہی الفاظ کے ساتھ بیان کرنے کا ارشاد فرمایا تھا۔ اسی لئے اس شخص کی نماز صحیح نہیں جو اس سورت کو پڑھنا جانتا ہو اور پھر نہ پڑھے۔ جیسے کہ بخاری ومسلم کی حدیث میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس شخص کی نماز نہیں جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔ صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا' اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان (نصف نصف) بانٹ لیا ہے' اس کا آدھا حصہ میرا ہے اور آدھا حصہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو وہ طلب کرے۔ جب بندہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد بیان کی' جب کہتا ہے الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اللہ فرماتا ہے' میرے بندے نے میری ثنا کی۔ جب وہ کہتا ہے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اللہ فرماتا ہے' میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی۔

عبادت اور طلب: ☆☆ جب وہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو وہ مانگے۔ پھر وہ آخر سورت تک پڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرا بندہ جو مجھ سے مانگے' اس کے لئے ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں اِيَّاكَ نَعْبُدُ کے معنی یہ ہیں کہ اے ہمارے رب ہم خاص تیری ہی توحید مانتے ہیں اور تجھ سے ہی ڈرتے ہیں اور تیری اسی ذات سے امید رکھتے ہیں۔ تیرے سوا کسی اور کی نہ ہم عبادت کریں' نہ ڈریں نہ امید رکھیں۔ اور اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ سے یہ مراد ہے کہ ہم تیری تمام اطاعت اور اپنے تمام کاموں میں تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ قتادہؒ فرماتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم ہے کہ تم سب اسی کی خالص عبادت کرو اور اپنے تمام کاموں میں اسی سے مدد مانگو اِيَّاكَ نَعْبُدُ کو پہلے لانا اس لئے ہے کہ اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی ہے اور مدد کرنا یہ عبادت کا وسیلہ اور اہتمام اور اس پر پختگی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زیادہ اہمیت والی چیز کو مقدم کیا جاتا ہے اور اس سے کمتر کو اس کے بعد لایا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں جمع کے صیغہ کو لانے کی یعنی ہم کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر یہ جمع کے لئے ہے تو کہنے والا تو ایک ہے اور اگر تعظیم کے لئے ہے تو اس مقام پر نہایت نامناسب ہے کیونکہ یہاں تو مسکینی اور عاجزی ظاہر کرنا مقصود ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گویا ایک بندہ تمام بندوں کی طرف سے خبر دے رہا ہے بالخصوص جبکہ وہ جماعت میں کھڑا ہو یا امام بنا ہوا ہو پس گویا وہ اپنی اور اپنے سب مومن بھائیوں کی طرف سے اقرار کر رہا ہے کہ وہ سب اس کے بندے ہیں اور اسی کی عبادت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور یہ ان کی طرف سے بھلائی کے لئے آگے بڑھا ہوا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ تعظیم کے لئے ہے گویا کہ بندہ جب عبادت میں داخل ہوتا ہے تو اسی کو کہا جاتا ہے کہ تو شریف ہے اور تیری عزت ہمارے دربار میں بہت زیادہ ہے تو اب اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کہا یعنی اپنے تئیں عزت سے یاد کر۔ ہاں اگر

عبادت سے الگ ہو تو اس وقت ہم نہ کہہ چاہے ہزاروں لاکھوں میں ہو کیونکہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محتاج اور اس کے دربار کے فقیر ہیں۔ بعض کا قول ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں جو تواضع اور عاجزی ہے وہ اِیَّاکَ عَبَدْنَا میں نہیں۔ اس لئے کہ اس میں اپنے نفس کی بڑائی اور اپنی عبادت کی اہلیت پائی جاتی ہے حالانکہ کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی پوری عبادت اور جیسی چاہئے ویسی ثناوصفت بیان کرنے پر قدرت ہی نہیں رکھتا۔ کسی شاعر کا قول ہے (ترجمہ) کہ مجھے اس کا غلام کہہ کر ہی پکارو کیونکہ میرا سب سے اچھا نام یہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کا نام عبد یعنی غلام ان ہی جگہوں پر لیا جہاں اپنی بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر کیا ہے جیسے قرآن نازل کرنا' نماز میں کھڑے ہونا' معراج کرانا وغیرہ۔ فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الخ فرمایا وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ الخ فرمایا سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ الخ ساتھ ہی قرآن پاک نے یہ تعلیم دی کہ اے نبیؐ جس وقت تمہارا دل مخالفین کے جھٹلانے کی وجہ سے تنگ ہو تو تم میری عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ فرمان ہے وَلَقَدْ نَعْلَمُ یعنی ہم جانتے ہیں کہ مخالفین کی باتیں تیرا دل دکھاتی ہیں تو ایسے وقت اپنے رب کی تسبیح اور حمد بیان کر اور سجدہ کر اور موت کے وقت تک اپنے رب کی عبادت میں لگا رہ۔ رازیؒ نے اپنی تفسیر میں بعض لوگوں سے نقل کیا ہے کہ عبودیت کا مقام رسالت کے مقام سے افضل ہے کیونکہ عبادت کا تعلق مخلوق سے خالق کی طرف ہوتا اور رسالت کا تعلق حق سے خلق کی طرف ہوتا ہے اور اس دلیل سے بھی کہ عبد کی کل اصلاح کے کاموں کا متولی خود اللہ تبارک وتعالیٰ ہوتا ہے اور رسول اپنی امت کی مصلحتوں کا والی ہوتا ہے لیکن یہ قول غلط ہے اور اس کی یہ دونوں دلیلیں بھی بودی اور لاحاصل ہیں۔ افسوس رازیؒ نے نہ تو اس کو ضعیف کہا' نہ اسے رد کیا۔ بعض صوفیوں کا قول ہے کہ عبادت یا تو ثواب حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے یا عذاب دفع کرنے کے لئے۔ وہ کہتے ہیں یہ کوئی فائدے کی بات نہیں اس لئے کہ اس وقت مقصود خود اپنی مراد کا حاصل کرنا ٹھہرا۔ اس کی تکالیف کے لئے آمادگی کرنا یہ بھی ضعیف ہے۔ اعلیٰ مرتبہ عبادت کا یہ ہے کہ انسان اس مقدس ذات کی جو تمام کامل صفتوں سے موصوف ہے محض اس کی ذات کے لئے عبادت کرے اور مقصود کچھ نہ ہو۔ اسی لئے نمازی کی نیت نہ نماز پڑھنے کی ہوتی ہے اگر وہ ثواب پانے اور عذاب سے بچنے کے لئے ہو تو باطل ہے۔ دوسرا گروہ ان کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ عبادت کا اللہ تعالیٰ کے لئے ہونا کچھ اس کے خلاف نہیں کہ ثواب کی طلب اور عذاب کا بچاؤ مطلوب نہ ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک اعرابی نے حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ حضور میں نہ تو آپ جیسا پڑھنا جانتا ہوں نہ حضرت معاذؓ جیسا میں تو اللہ تعالیٰ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور جہنم سے نجات چاہتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا اسی کے قریب قریب ہم بھی پڑھتے ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۶﴾

ہمیں سیدھی (اور سچی) راہ دکھا○

حصول مقصد کا بہترین طریقہ: ☆☆ (آیت:۵) جمہور نے صِرَاطَ پڑھا ہے۔ بعض نے سِرَاطَ کہا ہے اور زے کی بھی ایک قراۃ ہے۔ فرا کہتے ہیں' بنی عذرہ اور بنی کلب کی قراۃ یہی ہے چونکہ پہلے ثناوصفت بیان کی تو اب مناسب تھا کہ اپنی حاجت طلب کرے۔ جیسے کہ پہلے حدیث میں گذر چکا ہے کہ اس کا آدھا حصہ میرے لئے ہے اور آدھا میرے بندے کے لئے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو وہ طلب کرے۔ خیال کیجئے کہ اس میں کس قدر لطافت اور عمدگی ہے کہ پہلے پروردگار عالم کی تعریف وتوصیف کی۔ پھر اپنی اور اپنے بھائیوں کی حاجت طلب کی۔ یہ وہ لطیف انداز ہے جو مقصود کو حاصل کرنے اور مراد کو پالینے کے لئے تیر بہدف ہے۔ اس کامل طریقہ کو پسند فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی ہدایت کی۔ کبھی سوال اس طرح ہوتا ہے کہ سائل اپنی حالت اور حاجت کو ظاہر کر دیتا ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام نے کہا

تھا رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ پروردگار جو بھلائیاں تو میری طرف نازل فرمائے میں اس کا محتاج ہوں۔ حضرت یونس علیہ السلام نے بھی اپنی دعا میں کہا لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ الٰہی تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے۔ میں ظالموں میں سے ہوں۔ کبھی سوال اس طرح بھی ہوتا ہے کہ سائل صرف تعریف اور بزرگی بیان کر کے چپ ہو جاتا ہے۔ جیسے کسی شاعر کا قول ہے کہ مجھے اپنی حاجت کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تیری مہربانیوں بھری بخشش مجھے کافی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ داد و دہش تیری پاک عادتوں میں داخل ہے لیکن تیری پاکیزگی بیان کر دینا تیری حمد و ثنا کرنا ہی مجھے اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے کافی ہے۔ ہدایت کے معنی یہاں پر ارشاد اور توفیق کے ہیں۔ کبھی تو ہدایت بنفسہ متعدی ہوتی ہے جیسے یہاں ہے۔ تو معنی اَلْھِمْنَا وَفِّقْنَا اَرْزُقْنَا اور اَعْطِنَا یعنی ہمیں عطا فرمائے ہوں گے۔ اور جگہ ہے وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ یعنی ہم نے اسے دونوں راستے دکھا دیئے بھلائی اور برائی دونوں کے اور کبھی ہدایت ''الیٰ'' کے ساتھ متعدی ہوتی ہے جیسے فرمایا اِجْتَبٰہُ وَھَدٰہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ اور فرمایا فَاھْدُوْھُمْ اِلٰی صِرَاطِ الْجَحِیْمِ یہاں ''ہدایت'' ارشاد اور دلالت کے معنی میں ہے۔ اسی طرح فرمان ہے وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْ الخ یعنی تو البتہ سیدھی راہ دکھاتا ہے اور کبھی ہدایت لام کے ساتھ متعدی ہوتی ہے جیسے جنتیوں کا قول قرآن کریم میں ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا یعنی اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس کی راہ دکھائی یعنی توفیق دی اور ہدایت والا بنایا۔ صراط مستقیم کے معنی سنئے۔ امام ابو جعفر ابن جریرؒ فرماتے ہیں مراد اس سے واضح اور صاف راستہ ہے جو کہیں سے ٹیڑھا نہ ہو۔ عرب کی لغت میں اور شاعروں کے شعر میں یہ معنی صاف طور پر پائے جاتے ہیں اور اس پر بے شمار شواہد موجود ہیں۔ صراط کا استعمال بطور استعارہ کے قول اور فعل پر بھی آتا ہے اور پھر اس کا وصف استقامت اور ٹیڑھ پن کے ساتھ بھی آتا ہے۔ سلف اور متاخرین مفسرین سے اس کی بہت سی تفسیریں منقول ہیں اور ان سب کا خلاصہ ایک ہی ہے اور وہ اللہ اور رسولؐ کی اتباع اور تابعداری ہے۔

صراط مستقیم کیا ہے؟ ☆☆ ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ صراط مستقیم کتاب اللہ ہے۔ ابن ابی حاتم اور ابن جریرؒ نے بھی روایت کی ہے۔ فضائل قرآن کے بارے میں پہلے حدیث گذر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط رسی حکمتوں والا ذکر اور سیدھی راہ یعنی صراط مستقیم یہی اللہ کی کتاب قرآن کریم ہے۔ مسند احمد ترمذی۔ حضرت علیؓ کا قول بھی یہی ہے اور مرفوع حدیث کا بھی موقوف ہونا ہی زیادہ مشابہ ہے۔ واللہ اعلم۔ حضرت عبداللہ سے بھی یہی روایت ہے۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ جبرائیل علیہ السلام نے کہا کہ اے محمد ﷺ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کہئے یعنی ہمیں ہدایت والے راستہ کا الہام کر اور اس دین قیم کی سمجھ دے جس میں کوئی کجی نہیں۔ آپ سے یہ قول بھی مروی ہے کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ ابن عباسؓ ابن مسعودؓ اور بہت سے صحابہؓ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے جو ہر اس چیز سے جو آسمان اور زمین کے درمیان ہے زیادہ وسعت والا ہے۔ ابن حنفیہ فرماتے ہیں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دین ہے جس کے سوا اور دین مقبول نہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ کا قول ہے کہ صراط مستقیم اسلام ہے۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں بھی مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان کی کہ صراط مستقیم کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں ان میں کئی ایک کھلے ہوئے دروازے اور دروازوں پر پردے لٹک رہے ہیں۔ صراط مستقیم کے دروازے پر ایک پکارنے والا مقرر ہے جو کہتا ہے کہ اے لوگو تم سب کے سب اسی سیدھی راہ پر چلے جاؤ۔ ٹیڑھی ترچھی ادھر ادھر کی راہوں کو نہ دیکھو نہ ان پر جاؤ۔ اور اس راستے سے گزرنے والا جب کوئی شخص ان دروازوں میں سے کسی کو کھولنا چاہتا ہے تو ایک پکارنے والا کہتا ہے خبردار اسے نہ

کھولنا۔ اگر کھولا تو اس راہ لگ جاؤ گے اور صراط مستقیم سے ہٹ جاؤ گے۔ پس صراط مستقیم تو اسلام ہے اور دیواریں اللہ کی حدیں ہیں اور کھلے ہوئے دروازے اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور دروازے پر پکارنے والا قرآن کریم ہے اور راستے کے اوپر سے پکارنے والا زندہ ضمیر ہے جو ہر ایماندار کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور واعظ کے ہوتا ہے۔ یہ حدیث ابن ابی حاتم' ابن جریر' ترمذی اور نسائی میں بھی ہے اور اس کی اسناد حسن صحیح ہیں۔ واللہ اعلم۔

مجاہدؒ فرماتے ہیں' اس سے مراد حق ہے۔ ان کا قول سب سے زیادہ مقبول ہے اور مذکورہ اقوال کا کوئی مخالف نہیں۔ ابوالعالیہؒ فرماتے ہیں' اس سے مراد نبی ﷺ اور آپ کے بعد کے آپ کے دونوں خلیفہؓ ہیں۔ ابوالعالیہؒ اس قول کی تصدیق اور تحسین کرتے ہیں۔ دراصل یہ سب اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں۔ نبی کریم ﷺ اور آپ کے دونوں خلفاء صدیقؓ و فاروقؓ کا تابعدار حق کا تابع ہے اور حق کا تابع اسلام کا تابع ہے اور اسلام کا تابع قرآن کا مطیع ہے اور قرآن اللہ کی کتاب اس کی طرف کی مضبوط رسی اور اس کی سیدھی راہ ہے۔ لہذا صراط مستقیم کی تفسیر میں یہ تمام اقوال صحیح ہیں اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں۔ فالحمدللہ

حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ صراط مستقیم وہ ہے جس پر ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا۔ امام ابو جعفر بن جریر رحمتہ اللہ علیہ کا فیصلہ ہے کہ میرے نزدیک اس آیت کی تفسیر میں سب سے اولیٰ یہ ہے کہ ہم کو توفیق دی جائے اس کی جو اللہ کی مرضی کی ہو اور جس پر چلنے کی وجہ سے اللہ اپنے بندوں سے راضی ہوا ہو اور ان پر انعام کیا ہو۔ صراط مستقیم یہی ہے اس لئے کہ جس شخص کو اس کی توفیق مل جائے جس کی توفیق اللہ کے نیک بندوں کو تھی جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا تھا' جو نبی' صدیق' شہید اور صالح لوگ تھے' انہوں نے اسلام کی اور رسولوں کی تصدیق کی' کتاب اللہ کو مضبوط تھام رکھا' اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالائے' اس کے منع کئے ہوئے کاموں سے رک گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے چاروں خلیفوں اور تمام نیک بندوں کی راہ کی توفیق مل جائے گی تو یہی صراط مستقیم ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مومن کو تو اللہ کی طرف سے ہدایت حاصل ہو چکی ہے' پھر نماز اور غیر نماز میں ہدایت مانگنے کی کیا ضرورت؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مراد اس سے ہدایت پر ثابت قدمی اور رسوخ اور بینائی اور ہمیشہ کی طلب ہے۔ اس لئے کہ بندہ ہر ساعت اور ہر حالت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا محتاج ہے۔ وہ خود اپنی جان کے نفع نقصان کا مالک نہیں بلکہ دن رات اپنے اللہ کا محتاج ہے۔ اسی لئے اللہ نے اسے سکھایا کہ ہر وقت وہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرتا رہے اور ثابت قدمی اور توفیق چاہتا رہے۔ بھلا اور نیک بخت انسان وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے در کا بھکاری بنالے۔ وہ اللہ ہر پکارنے والے کی پکار کے قبول کرنے کا کفیل ہے بالخصوص بے قرار محتاج اور اس کے سامنے اپنی حاجت دن رات پیش کرنے والے کی ہر پکار کو قبول کرنے کا وہ ضامن ہے۔ اور جگہ قرآن کریم میں ہے یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ الخ اے ایمان والو! اللہ پر' اس کے رسولوں پر اس کی اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول کی طرف نازل فرمائی اور جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئیں' سب پر ایمان لاؤ۔

اس آیت میں ایمان والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا اور ہدایت والوں کو ایمان لانے کا حکم دینا ایسا ہی ہے جیسے یہاں ہدایت والوں کو ہدایت کی طلب کرنے کا حکم دینا۔ مراد دونوں جگہ ثابت قدمی اور استمرار ہے اور ایسے اعمال پر ہمیشگی کرنا جو اس مقصد کے حاصل کرنے میں مدد پہنچائیں۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہو بھی نہیں سکتا کہ یہ حاصل شدہ چیز کا حاصل کرنا ہے۔ واللہ اعلم۔ اور دیکھئے اللہ رب العزت نے اپنے ایمان دار بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ کہیں رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ

اَنْتَ الْوَهَّابُ الخ یعنی اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد ٹیڑھا نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما' تو بہت بڑا دینے والا اور عطا کرنے والا ہے۔ یہ بھی وارد ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز مغرب کی تیسری رکعت سورۂ فاتحہ کے بعد اس آیت کو پوشیدگی سے پڑھا کرتے تھے پس اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ ہمیں صراط مستقیم پر ثابت قدم رکھ اور اس سے ہمیں نہ ہٹا۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے انعام کیا نہ ان کی جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی ○

انعام یافتہ کون؟ ☆☆ اس کا بیان پہلے گذر چکا ہے کہ بندے کے اس قول پر خداوند کریم فرماتا ہے یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے کے لئے ہے جو کچھ وہ مانگے۔ یہ آیت صراط مستقیم کی تفسیر ہے اور نحویوں کے نزدیک یہ اس سے بدل ہے اور عطف بیان بھی ہو سکتی ہے واللہ اعلم۔ اور جن پر اللہ کا انعام ہوا' ان کا بیان سورۂ نساء میں آ چکا ہے۔ فرمان ہے وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ الخ یعنی اللہ اور اس رسول کے کہے پر عمل کرنے والے ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ کا انعام ہے۔ جو نبی' اور صدیق' شہید' صالح لوگ ہیں' یہ بہترین ساتھی اور اچھے رفیق ہیں۔ یہ فضل ربانی ہے اور اللہ جاننے والا کافی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں' مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ تو مجھے ان فرشتوں' نبیوں' صدیقوں' شہیدوں' اور صالحین کی راہ پر چلا جن پر تو نے اپنی اطاعت و عبادت کی وجہ سے انعام نازل فرمایا۔ یہ آیت ٹھیک وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ کی طرح ہے۔ ربیع بن انسؒ کہتے ہیں' اس سے مراد انبیاءؑ ہیں۔ ابن عباسؓ اور مجاہدؒ فرماتے ہیں' مومن ہیں۔ وکیعؒ کہتے ہیں مسلمان۔ عبدالرحمٰن فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ مراد ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول زیادہ معقول اور قابل تسلیم ہے۔ واللہ اعلم۔

جمہور کی قرات میں غیر رے کی زیر کے ساتھ ہے اور صفت ہے۔ زمخشری کہتے ہیں' رے کی زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے اور حال ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت عمر بن خطابؓ کی قرأت یہی ہے اور ابن کثیرؒ سے بھی یہی روایت کی گئی ہے عَلَيْهِمْ میں جو ضمیر ہے' وہ اس کا ذوالحال ہے اور اَنْعَمْتَ عامل ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ اللہ جل شانہ تو ہمیں سیدھا راستہ دکھا' ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ جو ہدایت اور استقامت والے تھے اور اللہ رسولؐ کے اطاعت گذار' اس کے حکموں پر عمل کرنے والے' اس کے منع کئے ہوئے کاموں سے رک رہنے والے تھے۔

مغضوب کون؟ ☆☆ (آیت:۶) ان کی راہ سے بچا' جن پر غضب و غصہ کیا گیا' جن کے ارادے فاسد ہو گئے' حق کو جان کر پھر اس سے ہٹ گئے اور گم گشتہ راہ لوگوں کے طریقے سے بھی ہمیں بچا لے جو سرے سے علم نہیں رکھتے' مارے مارے پھرتے ہیں' راہ سے بھٹکے ہوئے حیران و سرگرداں ہیں اور راہ حق کی طرف رہنمائی نہیں کئے جانے کو دوبارہ لا کر کلام کی تاکید کرنا اس لئے ہے کہ معلوم ہو جائے کہ یہاں دو غلط راستے ہیں۔ ایک یہود کا دوسرا نصاریٰ کا۔ بعض نحوی کہتے ہیں کہ غَيْرِ کا لفظ یہاں پر استثناء کے لئے ہے تو استثناء منقطع ہو سکتا ہے کیونکہ جن پر انعام کیا گیا ہے ان میں سے استثناء ہونا تو درست ہے مگر یہ لوگ انعام والوں میں داخل ہی نہ تھے۔ لیکن ہم نے جو تفسیر کی ہے' یہ بہت اچھی ہے عرب شاعروں کے شعر میں ایسا پایا جاتا ہے کہ وہ موصوف کو حذف کر دیتے ہیں اور صرف صفت بیان کر دیا کرتے ہیں اسی طرح اس آیت میں بھی صفت کا بیان ہے اور موصوف محذوف ہے۔ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ سے مراد غَيْرِ الصِّرَاطِ الْمَغْضُوْبِ ہے۔ مضاف الیہ کے ذکر

سے کفایت کی گئی اور مضاف بیان نہ کیا گیا۔ اس لئے کہ نشست الفاظ ہی اس پر دلالت کر رہی ہے۔ پہلے دو مرتبہ یہ لفظ آ چکا ہے۔ بعض کہتے ہیں وَلَا الضَّآلِّيْنَ میں لَا زائد ہے اور ان کے نزدیک تقدیر کلام اس طرح ہے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلِّيْنَ اور اس کی شہادت عرب شاعروں کے شعر سے بھی ملتی ہے لیکن صحیح بات وہی ہے جو ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَغَيْرِ الضَّآلِّيْنَ پڑھنا صحیح سند سے مروی ہے۔ اور اسی طرح حضرت ابی بن کعب سے بھی روایت ہے اور یہ محمول ہے اس پر کہ ان بزرگوں سے یہ بطور تفسیر صادر ہوا۔ تو ہمارے قول کی تائید ہوئی کہ لا نفی کی تاکید کے لئے ہی لایا گیا ہے تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ یہ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پر عطف ہے اور اس لئے بھی کہ دونوں راہوں کا فرق معلوم ہو جائے تاکہ ہر شخص ان دونوں سے بھی بچتا رہے۔ اہل ایمان کا طریقہ تو یہ ہے کہ حق کا علم بھی ہو اور حق پر عمل بھی ہو۔ یہودیوں کے ہاں عمل نہیں اور نصاریٰ کے ہاں علم نہیں۔ اسی لئے یہودیوں پر غضب ہوا اور نصرانیوں کو گمراہی ملی۔ اس لئے کہ علم کے باوجود عمل کو غضب کا چھوڑنا سبب ہے اور نصرانی گو ایک چیز کا قصد کرنے کے باوجود صحیح راستہ کو نہیں پا سکتے اس لئے کہ ان کا طریقہ کار غلط ہے اور اتباع حق سے ہٹے ہوئے ہیں۔ یوں تو غضب اور گمراہی ان دونوں جماعتوں کے حصہ میں ہے لیکن یہودی غضب کے حصہ میں پیش پیش ہیں۔ جیسے کہ اور جگہ قرآن کریم میں ہے مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ اور نصرانی ضلالت میں بڑھے ہوئے ہیں۔ فرمان الٰہی ہے قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ یعنی یہ پہلے ہی سے گمراہ ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر بھی چکے ہیں اور سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ اس کی تائید میں بہت سی حدیثیں اور روایتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

مسند احمد میں ہے۔ حضرت عدی بن حاتمؓ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے لشکر نے میری پھوپھی اور چند اور لوگوں کو گرفتار کر کے حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تو میری پھوپھی نے کہا' میری خبر گیری کرنے والا غائب ہے اور میں عمر رسیدہ بڑھیا ہوں جو کسی خدمت کے لائق نہیں' آپ مجھ پر احسان کیجئے اور مجھے رہائی دیجئے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر بھی احسان کرے گا۔ حضورؐ نے دریافت کیا کہ تیری خیر خبر لینے والا کون ہے؟ اس نے کہا عدی بن حاتم۔ آپؐ نے فرمایا وہی جو اللہ اور رسول سے بھاگتا پھرتا ہے؟ پھر آپ نے اسے آزاد کر دیا۔ جب لوٹ کر آپ آئے تو آپ کے ساتھ ایک شخص تھے اور غالباً وہ حضرت علیؓ تھے۔ آپؐ نے فرمایا' لو ان سے سواری مانگ لو۔ میری پھوپھی نے ان سے درخواست کی جو منظور ہوئی اور سواری مل گئی۔ وہ یہاں سے آزاد ہو کر میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں کہ حضورؐ کی سخاوت نے تیرے باپ حاتم کی سخاوت کو بھی ماند کر دیا' آپ کے پاس جو آتا ہے وہ خالی ہاتھ واپس نہیں جاتا۔ یہ سن کر میں بھی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ چھوٹے بچے اور بڑھیا عورتیں بھی آپ کی خدمت میں آتی جاتی ہیں اور آپ ان سے بھی بے تکلفی کے ساتھ بولتے ہیں۔ اس بات نے مجھے یقین دلا دیا کہ آپ قیصر و کسریٰ کی طرح بادشاہت اور وجاہت کے طلب کرنے والے نہیں۔ آپؐ نے مجھے دیکھ کر فرمایا' عدی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے سے کیوں بھاگتے ہو؟ کیا اللہ کے سوا اور کوئی عبادت کے لائق ہے؟ اَللّٰهُ اَكْبَر کہنے سے کیوں منہ موڑتے ہو؟ کیا اللہ عزوجل سے بھی بڑا کوئی ہے؟ مجھ پر ان کلمات نے آپ کی سادگی اور بے تکلفی نے ایسا اثر کیا کہ میں فوراً کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا جس سے آپ بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود ہیں اور الضَّآلِّيْنَ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عدیؓ کے سوال پر حضورؐ نے یہ تفسیر ارشاد فرمائی تھی۔ اس حدیث کی بہت سی سندیں ہیں اور مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ بنو قین کے ایک شخص نے وادی القریٰ میں حضور سے یہی سوال کیا آپ نے جواب میں یہی فرمایا۔ بعض روایتوں میں ان کا نام عبداللہ ابن عمروؓ ہے۔ واللہ اعلم۔

ابن مردویہ میں ابوذرؓ سے بھی یہی روایت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ' حضرت ابن مسعودؓ اور بہت سے صحابیوں سے بھی یہ تفسیر منقول ہے۔ ربیع بن انس عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم وغیرہ بھی یہی فرماتے ہیں بلکہ ابن ابی حاتم تو فرماتے ہیں کہ مفسرین میں اس بارے میں کوئی اختلاف ہی نہیں۔ ان ائمہ کی اس تفسیر کی دلیل ایک تو وہ حدیث ہے جو پہلے گذری۔ دوسری سورۂ بقرہ کی یہ آیت جس میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے کہا گیا ہے بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ الخ اس آیت میں کہ اس پر غضب پر غضب نازل ہوا۔ اور سورۂ مائدہ کی آیت قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ الخ میں بھی ہے کہ ان پر غضب الٰہی نازل ہوا۔ اور جگہ فرمان الٰہی ہے لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ یعنی بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کیا' ان پر لعنت کی گئی۔ داؤد علیہ السلام اور عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی زبانی یہ بوجہ ان کی نافرمانی اور حد سے گذر جانے کے ہے' یہ لوگ کسی برائی کے کام سے آپس میں روک ٹوک نہیں کرتے تھے یقیناً ان کے کام بہت برے تھے اور تاریخ کی کتابوں میں ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل جبکہ دین خالص کی تلاش میں اپنے ساتھیوں سمیت نکلے اور ملک شام میں آئے تو ان سے یہودیوں نے کہا کہ آپ ہمارے دین میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک غضب الٰہی کا ایک حصہ نہ پالو۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس سے بچنے کے لئے تو دین حق کی تلاش میں نکلے ہیں۔ پھر اسے کیسے قبول کر لیں؟ پھر نصرانیوں سے ملے' انہوں نے کہا جب تک خداوند تعالیٰ کی ناراضگی کا حصہ نہ لیں تب تک آپ ہمارے دین میں نہیں آ سکتے۔ انہوں نے کہا ہم یہ بھی نہیں کر سکتے چنانچہ وہ اپنی فطرت پر ہی رہے۔ بتوں کی عبادت اور قوم کا دین چھوڑ دیا لیکن یہودیت یا نصرانیت اختیار نہ کی۔ البتہ زید کے ساتھیوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس لئے کہ یہودیوں کے مذہب سے یہ ملتا جلتا تھا انہی میں حضرت ورقہ بن نوفل تھے۔ انہیں نبی کریم ﷺ کی نبوت کا زمانہ ملا اور ہدایت الٰہی نے ان کی رہبری کی اور یہ حضورؐ پر ایمان لائے اور جو وحی اس وقت تک اتری تھی' اس کی تصدیق کی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

مسئلہ: ☆☆ ضاد اور ظے کی قرأت میں بہت باریک فرق ہے اور ہر ایک کے بس کا نہیں۔ اس لئے علمائے کرام کا صحیح مذہب یہ ہے کہ یہ فرق معاف ہے' ضاد کا صحیح مخرج تو یہ ہے کہ زبان کا اول کنارہ اور اس کے پاس کی داڑھیں اور ظے کا مخرج زبان کا ایک طرف اور سامنے والے اوپر کے دو دانت کے کنارے۔ دوسرے یہ کہ یہ دونوں حرف مجہورہ اور رخوہ اور مطبقہ ہیں۔ پس اس شخص کو جسے ان دونوں میں تمیز کرنی مشکل معلوم ہو' اسے معاف ہے کہ ضاد کو ظے کی طرح پڑھ لے۔ ایک حدیث میں ہے کہ میں ضاد کو سب سے زیادہ صحیح پڑھنے والا ہوں لیکن یہ حدیث بالکل بے اصل اور لا پتہ ہے۔

الحمد کا تعارف و مفہوم: ☆☆ یہ مبارک سورت نہایت کارآمد مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان سات آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد' اس کی بزرگی' اس کی ثنا و صفت اور اس کے پاکیزہ ناموں کا اور اس کی بلند و بالا صفتوں کا بیان ہے۔ ساتھ ہی قیامت کے دن کا ذکر ہے اور بندوں کو ارشاد ہے کہ وہ اس مالک سے سوال کریں۔ اس کی طرف تضرع و زاری کریں' اپنی مسکینی اور بے کسی اور بے بسی کا اقرار کریں اور اس کی عبادت خلوص کے ساتھ کریں اور اس کی توحید الوہیت کا اقرار کریں۔ اسے شریک' نظیر اور مثل سے پاک اور برتر جانیں۔ صراط مستقیم اور اس پر ثابت قدمی اس سے طلب کریں تاکہ یہی ہدایت انہیں قیامت والے دن پل صراط سے بھی پار اتارے اور نبیوں' صدیقوں' شہیدوں اور صالحوں کے پڑوس میں جنت الفردوس میں جگہ دلائے۔ ساتھ ہی اس سورت میں نیک اعمال کی ترغیب ہے تاکہ قیامت کے دن نیکوں کا ساتھ ملے اور باطل راہوں پر چلنے سے ڈراوا پیدا ہوتا کہ قیامت کے دن بھی یہ باطل پرست یہود و نصاریٰ کی جماعت سے دور ہی رہیں۔

اس باریک نکتہ پر بھی غور کیجئے کہ انعام کی اسناد تو اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی اور اَنْعَمْتَ کہا گیا لیکن غضب کی اسناد اللہ کی طرف نہیں کی گئی۔ یہاں فاعل حذف کر دیا اور مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کہا گیا۔ اس میں پروردگار عالم کی جناب میں ادب کیا گیا ہے۔ دراصل حقیقی